مجید امجد کی شبِ رفتہ: تعارفی مطالعہ

ڈاکٹر تنویر حسین
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور

MAJEED AMJAD'S SHAB E RAFTA
AN INTRODUCTORY STUDY

Tanvir Husain, PhD
Assistant Professor of Urdu
Govt. Islamia College Railway Road, Lahore

Abstract

Majeed Amjad has recently attracted the attention of verse lovers and critics alike. Majeed is admired for his unique style, diction and dealing of the issues through his poetry. Shab e Rafta is his first book on poetry. He has dealt a variety of issues in this book. He developed special feelings for his surrounding world including that of animals', birds' and trees'. Tree has a special reference in his verse which also emerges as a symbol. Besides other issues, he has also written on the philosophy of time and mortality. This article specially focuses this aspect of Majeed's in the light of his book Shab e Rafta.

Keywords:
Jhang, Islamia College Railway Road, Nazeer Akbarabadi, Maulana Hali, Muhammad Husain Azad, Allama Iqbal.

مجید امجد ۲۹ جون ۱۹۱۴ء جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والدین میں علیحدگی ہوگئی۔ اس لیے انھیں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننھیال کے ہاں رہنا پڑا۔ آپ کے نانا جان میاں نور محمد ایک عالم فاضل شخص تھے۔ مجید امجد نے ابتدائی تعلیم انھی سے حاصل کی۔ دینی تعلیم کے علاوہ عربی، فارسی اور طب کی تعلیم گھر کے قریب واقع مسجد میں حاصل کی۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد بی۔اے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے ۱۹۳۴ء میں کیا۔ اس دور میں معاشی بحران نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، اس لیے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی ملازمت کے دروازے اتنی آسانی سے نہیں کھلتے تھے۔ بہر حال جھنگ کے مقامی ہفت روزہ ''عروج'' کی ادارت آپ کے حصے میں آئی اور یہی آپ کی عملی زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔ آپ کی ادبی کاوشوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی اسی رسالے سے ہوا۔ بعد ازاں ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں بطور کلرک فرائض انجام دیے۔ جنگِ عظیم دوّم (۱۹۴۴ء) کے دوران میں حکومت کی طرف سے سول سپلائز محکمے کی داغ بیل ڈالی گئی تو مجید امجد اسسٹنٹ سول سپلائز منتخب ہوگئے۔ اس محکمے کا جب محکمۂ فوڈ میں ادغام ہوا تو چند برسوں بعد مجید امجد اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ اپنی اس ملازمت کی وجہ سے آپ نے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور شہروں میں کام کیا۔ آپ نے اپنی ملازمت کے ماہ و سال زیادہ تر شہر منٹگمری (اب ساہیوال) کی نذر کیے۔ بچپن میں آپ شفقتِ پدری سے محروم رہے۔ شادی کی لیکن بیگم سے اوّل روز ہی سے نبھاؤ نہ ہوسکا۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا مجید امجد انتہائی خاموش طبع انسان تھے۔ ان کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہیے، وہ ایک لفظ اپنے ہونٹوں پر نہیں لائیں گے۔ البتہ اگر کوئی شخص سوال پوچھتا تو بہت مختصر جواب دیتے تھے۔ فارسی اور انگریزی شاعری کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور سائنسی علوم سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ بعض شعرا اپنی خوبیاں خود ہی بیان کرتے ہیں لیکن مجید امجد اپنی ذات اور اپنی شاعری کو اپنی گفت گو کا حصہ نہیں بناتے تھے۔ ملازمت کے معاملے میں نہایت فرض شناس تھے۔ وقت کے پابند تھے۔ اپنے فرائض نہایت دیانت داری سے انجام دیتے تھے۔ جب ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو پنشن ملنے میں اتنی تاخیر ہوئی کہ فاقوں تک نوبت آگئی۔ کسی کو اپنا دکھ بھی نہیں بتایا۔ ان کا پرانا خدمت گار حسبِ معمول رات کو ان کے کوارٹر (فرید ٹاؤن ساہیوال) کو باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔ جب اس نے ۱۱ رمئی ۱۹۷۴ء کو واپس آ کر تالا کھولا تو مجید امجد زمین پر مردہ حالت میں پائے گئے۔ ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر نے ان کی لاش کو جھنگ پہنچانے کا اہتمام کیا۔ ان کے جنازے میں چند لوگ شریک ہوئے۔

اُردو نظم دکن سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہوئی نظیر اکبر آبادی، مولانا حالی، محمد حسین آزاد، علامہ اقبال اور دیگر معاصرین تک پہنچتی ہے تو اپنے ساتھ تہذیبی وثقافتی، اخلاقی، فطری، فکری، قومی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مضامین لاتی ہے۔ ہر نیا آنے والا شاعر اپنے اندازِ فکر سے اس کے چہرے کے حسن میں اضافہ کرتا نظر آتا ہے۔ یہ اضافہ اُسلوب، مواد اور ہیئت غرض ہر لحاظ سے ہماری نظم کو باثروت بناتا ہے۔ اقبال نے تو اُردو نظم کو امتِ مسلمہ کو بیدار کرنے کے لیے استعمال کیا۔ رومانوی تحریک نے اُردو نظم کی زلفیں سنواریں، ترقی پسند تحریک نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ آواز بلند کی کہ مزدور، دہقان، مفلس وقلاش اور مجبور ولاچار انسان بھی خوراک، صحت، رہائش اور معاشی آسودگی کا حق دار ہے۔ اس کے ساتھ نظم کے حوالے سے میراجی، راشد، فیض اور مجید امجد اُردو نظم کے آسمان کے درخشندہ ستارے ہیں۔

''شبِ رفتہ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ کائنات ہمارے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ اس کائنات میں گُل پھول بھی موجود ہیں، چمن میں بادِ نسیم بھی چلتی ہے۔ سلسلۂ روز وشب بھی نظر آتا ہے۔ چاندنی راتوں کی ٹھنڈک سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ستاروں کے جُھرمٹ کے حُسن میں ہم کھو جاتے ہیں۔ ہمیں محل، تخت اور تاج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی کا بھی ہم نظارہ کرتے ہیں، کانوں کے بندے بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ کہیں کنواں چل رہا ہے، کہیں پرندے نظر آتے ہیں، کوئی بھکارن اپنی آواز سے راہگیروں کو جکڑنے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ کہیں بھوزا پھولوں پر بیٹھا اور کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر ایک کیڑا رینگ رہا ہے۔ پان کی دکانیں تو ہر بازار کے منظر نامے کا لازمی حصّہ ہیں۔ کتنے ہی ہم گرے پڑے، بوسیدہ اور خمیدہ پیڑ دیکھتے ہیں۔ ہماری دھرتی کے سینے پر مختلف فصلیں اُگتی ہیں، جو ہماری دھرتی کی شوبھا اور اس کا مان ہیں۔ مقبرۂ جہانگیر کی کس نے سیر نہ کی ہوگی اور بکریوں کے ریوڑ بھی ہم دیکھتے رہتے ہیں۔

ہم کائنات کے اس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ کائنات کیوں تخلیق ہوئی؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا مذکورہ اشیا کے اندر کوئی مفہوم چُھپا ہے؟ کیا ان سب پردوں کے پیچھے کوئی کہانی چل رہی ہے؟ کیا ان عام سی چیزوں میں بھی کوئی بھید ہے؟ مجید امجد کی شاعری میں یہ خوبی ہے کہ وہ ہمارے گردوپیش پائی جانے والی اشیا پر ایک گہری نظر ڈالنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایک عام سے درخت، اس کے پتے یا پھول سے بھی ایسی بات کشید کر لیتا ہے جس کی طرف عام انسان کا ذہن سفر نہیں کر سکتا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مجید امجد کی شاعری میں بڑی بڑی باتوں کے روپ میں

متشکل ہوتی ہیں۔ جتنا دکھ درد مجید امجد کے دل میں بھرا ہوا ہے، اس سے کہیں زیادہ دکھ درد انھیں باہر کی دنیا میں دکھائی دیتا ہے۔ مجید امجد کی زندگی بھی میر تقی میر کی طرح دکھوں میں گزری۔ بچپن میں والدین کی علیحدگی، گھر بسایا تو شریکِ حیات کے ساتھ ایک قدم نہ چل سکے۔ ان کی شاعری کی طرف ناقدینِ فن نے توجہ نہ دی۔ پہلے مجموعہ "شبِ رفتہ" کی طرف ادبی حلقوں کی عدمِ توجہ کی وجوہات میں مجید امجد کا بڑے مراکز سے دور رہنا، اپنا نیا انوکھا لب ولہجہ اور شہرت سے بے نیازی سب شامل تھیں۔ ان کی ایک نظم "راتوں کو...." کی یہ سطور ملاحظہ کیجیے:

ان سونی تنہا راتوں میں
دل ڈوب کے گزری باتوں میں
جب سوچتا ہے، کیا دیکھتا ہے، ہر سمت دھوئیں
کا بادل ہے
وادی وبیاباں جل تھل ہے
ذخار سمندر سوکھے ہیں، پُرہول چٹانیں پگھلی ہیں
دھرتی نے ٹوٹتے تاروں کی جلتی ہوئی لاشیں نگلی ہیں
پہنائے زماں کے سینے پر اک موج انگڑائی لیتی ہے
اس آب وگل کی دلدل میں اِک چاپ سنائی دیتی ہے
اک تھرکن سی، اک دھڑکن سی، آفاق کی ڈھلوانوں میں کہیں
تانیں جو ہمک کر ملتی ہیں، چل پڑتی ہیں، رکتی ہی نہیں،
ان راگنیوں کے بھنور بھنور میں صدہا صدیاں گھوم گئیں
اس قرن آلود مسافت میں لاکھ آبلے پھوٹے، دیپ بجھے
اور آج کسے معلوم، ضمیرِ ہستی کا آہنگِ تپاں
اک سانس کی رو تک پہنچا ہے
اس میرے میز پہ جلتی ہوئی قندیل کی لو تک پہنچا ہے
کون آیا ہے؟ کون آتا ہے؟ کون آئے گا؟
انجانے من کی مور کھتا کو کیا کیا دھیان گزرتا ہے

دل ڈرتا ہے

دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے

مجید امجد دردمند دل اور حسّاس طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کا قلم انسان کی مصیبتوں، مشکلوں اور مجبوریوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ مجید امجد انسانوں کے ساتھ ساتھ پرندوں، جانوروں اور درختوں کا کرب بھی محسوس کرتے ہیں۔ مجید امجد نے اپنی زندگی کا بہت سا حصّہ کھیتوں، کھلیانوں، باغوں، جنگلوں، میدانوں، بیابانوں، کنوؤں، راجباہوں اور پگڈنڈیوں کے درمیان چلتے پھرتے گزارا ہے، اس لیے ان کی شاعری میں فطری ماحول کی عکاسی نظر آتی ہے۔ مجید امجد درختوں سے محبت کرتے ہیں۔ گھنے سایہ دار پیڑ انسان کو سایہ فراہم کرتے ہیں۔ تازہ آکسیجن دیتے ہیں، دھوپ کے آگے ڈٹ جاتے ہیں۔ شجر مجید امجد کی شاعری میں ایک علامت کے طور پر ابھرا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اس علامت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''مجید امجد کی شاعری کا سرسری سا مطالعہ بھی اس بات کی گواہی دے گا کہ اس کے ہاں ہرے بھرے شجر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نے شجر کو نہ صرف اس کے ہر رنگ روپ میں دیکھا ہے بلکہ زاویۂ نگاہ کو بدل کر بھی اس کا نظارہ کیا ہے۔ مجید امجد کے لیے یہ شجر بیک وقت ایک دوست، محبوب، دست گیر، سخی اور بھکاری ہے اور آخر میں تو محسوس ہوتا ہے جب خود مجید امجد بھی کسی تر و تازہ پیڑ ہی کا ایک روپ ہے۔ ایک ایسا پیڑ جس نے زمین کو اپنے قلاوے میں جکڑ رکھا ہے مگر جس کا چھتنار سر اُٹھائے آسمان سے محوِ گفتگو ہے۔''(۱)

''شبِ رفتہ'' کی یہ نظم دیکھیے:

تنگ - پگڈنڈی سرِ کسار بل کھاتی ہوئی
نیچے دونوں سمت گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جُھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخلِ بلند

تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے

ایک بوسیدہ ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سیکڑوں گرتے ہوؤں کی دست گیری کا امین
آہ ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

مجید امجد کی شاعری کے مطالعے سے زندگی کی بے مائیگی اور ناپائیداری کا تصوّر ابھرتا ہے۔رہِ زیست میں ہم بے خطر جا رہے ہیں اور ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ کہاں اور کدھر جا رہے ہیں جب ہمارے دل میں اس حیاتِ مُستعار کا خیال پیدا ہوتا ہے تو مٹی کے ایک گھر کی آغوشِ آرام یاد آ جاتی ہے اور پھر ہمیں یقین آ جاتا ہے کہ یہ بزمِ فانی غم جاودانی کی کہانی ہے۔یہیں سے ہمارا دھیان وقت کی حقیقت کی طرف چلا جاتا ہے۔وقت کے پھیلاؤ اور بے کرانی پر حیرت بھی ہوتی ہے اور پھر یہ حیرت ہماری روح پر کاری ضرب لگاتی ہے، جس سے افسردگی اور اداسی جنم لیتی ہے۔مجید کے ہاں وقت کے حوالے سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں:

''مجید امجد اس دور کا واحد فلسفی شاعر ہے جس کے ہاں سب سے زیادہ جو تصوّر ابھرتا ہے وہ وقت کے بارے میں ہے۔امجد کی پوری شاعری پر وقت کا احساس حاوی ہے۔کبھی کبھی تو یہ خیال آنے لگتا ہے کہ اس کے ہاں خدا کا متبادل وقت ہے۔''خدائے وقت تو ہے جاودانی'' جیسے مصرعوں سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔اس کے ہاں کائنات کا چکر گھومتے وقت کے دَم سے رواں ہوتا ہے اور وقت ایک ایسی ازلی اور ابدی قوت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو ساری کائنات کو چلا رہا ہے مگر اسے چلانے والا نا معلوم ہے۔''(۲)

''شبِ رفتہ'' کی بعض نظمیں پڑھتے ہوئے وقت ایک سوال اور ایک پہیلی کے طور پر سامنے آتا ہے۔''جینے والے''، ''واماندہ''، ''اور آج سوچتا ہوں'' اور ''حرفِ اوّل'' اس کی مثالیں ہیں۔ ''کنواں''، ''امروز'' اور ''ایک نظم'' میں تو ''وقت'' مرکزی اور مکمل حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ایسے

محسوس ہوتا ہے جیسے وقت نے ہم پر ایک سائبان تان دیا ہے اور ہماری زندگی کی چند روزہ ساعتیں بہت عارضی اور محدود ہیں۔ڈاکٹر سہیل احمد خان اس ضمن میں کہتے ہیں:

''مجید امجد وقت کی قہاری کو زندگی کے چھوٹے چھوٹے مظاہر سے پیوست کرتے ہیں۔دورِ زماں پر اگر کونیاتی سطح سے اگر غور کیا جائے تو اپنی ہستی میں بھی شک آ پڑتا ہے۔اپنی عمر حتیٰ کہ تہذیبوں کی عمر بھی مختصر وقفہ ہے۔اپنے شعور میں وقت کے اس تسلسل کو جگہ دی جائے تو زندگی گزارنا بھی مشکل ہے۔ایک گہرا احساسِ الم دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔اس لیے وقت اور اپنی ذات کے درمیان کسی نہ کسی انداز کا حصار کھینچنا پڑتا ہے، یہ وقت کے بہاؤ میں تھوڑی سی جگہ پر ہی سہی قدم جمانے اور اپنی ہستی کو بچانے کی کوشش ہے۔بعض اوقات تو ہماری بے خبری خود حصار بن جاتی ہے۔زمین پر رہتے ہوئے زمین کی گردش کا ہمیں پتہ بھی نہیں ہوتا۔اس طرح عام انسانوں کا وقت سے سروکار اسی حد تک رہتا ہے جس حد تک وہ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔تاہم وہ شاعر جو وقت کا عظیم رویّہ لیے ہوئے ہے، اس کی صورتِ حال مختلف ہو جاتی ہے۔''(۴)

نظم ''امروز'' کا یہ بند دیکھیے:

مجھے کیا خبر، وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدّر کے کتنے کھلونے، زمانوں کے ہنگامے صدیوں کے صدہا، ہیولے
مجھے کیا تعلق __ میری آخری سانس کے بعد بھی دوشِ گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل، جو تاروں کو چھو لے
مگر آہ یہ لمحۂ مختصر __ جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے!
مرے ساتھ ہے، میرے بس میں ہے، میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لیے اس خراباتِ شام و سحر میں یہی کچھ!
یہ اک مہلتِ کاوشِ دردِ ہستی! یہ اک فرصتِ کوششِ آہ و نالہ

شاعر نے فرداودی سے بے خبری اور بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے لمحۂ مختصر جو حال کی صورت

میں ہے کوزادِ سفر قرار دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا اس کی نظموں میں حال کے لمحے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ حال کا شاعر ہے۔ حال کے بھی اس لمحے کا شاعر جو ابھی تھا اور ابھی نہیں ہے۔ جو ابھی مستقبل تھا اور ابھی ماضی کا ایک حصّہ بن گیا ہے لیکن مجید امجد کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ حال کے اس لمحے کو اپنی گرفت میں لے کر وقت کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ چناں چہ چند لمحوں کے لیے وقت کا مدوجزر جامد اور ساکن ہو کر اس کے سامنے آجاتا ہے اور اس کی نظر قرنوں، صدیوں اور زمانوں پر محیط ہو جاتی ہے۔(۴)

''امروز'' کا آخری بند ملاحظہ کیجیے:

یہ صہبائے امروز، جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بدورِ حیات آ گئی ہے، یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تُلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیائے امروز میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے۔
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں!
انھی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

ڈاکٹر سہیل احمد خان وقت کے پھیلاؤ گرد و پیش کے ان چھوٹے چھوٹے مناظر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ''...وقت کے اس پھیلاؤ کو قابلِ برداشت بنانے کے لیے مجید امجد نے حال کے لمحے اور گرد و پیش کے چھوٹے چھوٹے مناظر کو حصار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ہواؤں سے ہلتے ہوئے تلسی کے پودے ہتھیلی پر لبالب پیالہ بھرا ہوا 'امروز' کا پیالہ پڑوسن کے تلکے پر چھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی کوئل کا مستانہ بلاوا، یوں زندگی اپنی تمام تر المناکیوں کے باوجود ایک سطح پر شاداب اور روشن ہو جاتی ہے۔ گویا احساس ضرور رہتا ہے کہ روشنی کے ان چھوٹے چھوٹے رقبوں کے چاروں طرف ایک بہت بڑا سیاہ دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ بہر حال اس رویے کی وجہ سے مجید امجد کے فن کے دونوں موضوعاتی دائرے یعنی گرد و پیش کی واقعیت اور زمان و مکاں کا فلسفیانہ احساس ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں جو بڑی تشکیکِ کائنات کو کونیاتی رُخ سے دیکھنے پر پیدا ہوتی ہے۔ اس کا کچھ مداوا یہ ننھی ننھی خوشیاں کر دیتی ہیں۔(۵)

ڈاکٹر ضیاءالحسن مجید امجد کی شاعری میں وقت کی لامحدودیت کے سامنے انسان کی محدودیت اور اس کے بے ثباتی کے ضمن میں کہتے ہیں کہ مجید امجد ایسے شاعر ہیں جو بظاہر وقت کی لامحدودیت کے سامنے انسان کی چند روزہ زندگی کی اختصاریت پر بے بسی کا احساس پیدا کرتے ہیں لیکن دراصل وہ اس کے ذریعے چند روز کی مہلت زندگی کی نایابی کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اپنے قاری کو یہ نعمت ہر ہر پل استعمال کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔وقت کی لامحدودیت اور اس کے سامنے انسان کی محدودیت اور بے ثباتی ایک ایسا موضوع ہے جو روزِ ازل سے ہی انسان کو پریشان کرتا آیا ہے لیکن مجید امجد جیسے شاعر ہمارے اندر ایسے جذبات پیدا کرتے ہیں کہ انسان کو پریشان ہو کر اس محدود وقت کو ضائع نہیں کر دینا چاہیے بل کہ اس کے ہر پل سے لطف اندوز ہونا چاہیے،صرف خوشی سے نہیں بلکہ غم سے بھی کیوں کہ غم بھی وقتی اور فانی ہے۔(۶)

''شبِ رفتہ'' کی نظموں میں موت کا تصور بھی ابھرتا ہے:

موت کتنی تیرہ و تاریک ہے
ہو گی ، لیکن مجھ کو اس کا غم نہیں
قبر کے اندھے گڑھے کے اس طرف
اس طرف ، باہر ، اندھیرا کم نہیں
(ایک نظم)

کون اس گتھی کو سلجھائے ، دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دُکھ کی آندھی جھیلی
دو کڑوی سانسیں لیں ، دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو ، کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی اَرتھی اُٹھی ، بابا اللہ بیلی
(پنواڑی-شبِ رفتہ)

''مقبرۂ جہانگیر'' مجید امجد کی ایک اہم ترین نظم ہے۔یہ نظم پڑھتے ہوئے مغل بادشاہوں کے جاہ و جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ماضی کا یہ جاہ و جلال کھانستی صدیوں کا تھوکا ہوا قصہ معلوم ہوتا ہے۔مقبرے کو دیکھ کر گزرے ادوار کی لاشیں اور ڈھلتی ہوئی تہذیبیں یاد آتی ہیں۔

یہ وقت کا پھیلاؤ ہے۔ وقت نے سب کچھ نگل لیا ہے اور آج ہم ان آثار کو دیکھ کر اداس اور مغموم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح 'مبدا'، 'دور کے پیڑ'، 'گلی کا چراغ'، 'سوکھا تنہا پتا'، 'طلوعِ فرض'، 'دور کے پیڑ'، 'منٹو'، 'بن کی چڑیا'، 'ہری بھری فصلو'، 'ریوڑ' اور 'آٹوگراف' نہایت اچھوتی اور منفرد نظمیں ہیں۔

مجید امجد فنِ شعر پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں روایتی ہیئتیں نظر آتی ہیں لیکن بعد میں انھوں نے اتنی ہیئتی تبدیلیاں کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کی یہ ہیئتی تبدیلیاں نوآموز شعرا کے لیے نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مجید امجد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ عربی، فارسی، اُردو، پنجابی اور ہندی کے مزاج آشنا تھے۔ ان کے مصرعوں میں الفاظ ہیروں کی طرح جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مصرعوں میں پائی جانے والی موسیقیت اور نغمگی کانوں میں رس گھولتی ہے۔ ان کے الفاظ بھی انوکھے ہوتے ہیں اور ان کا خیال بھی اچھوتا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدینِ فن مجید امجد کو بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات وحواشی

(۱) وزیر آغا، "مجید امجد کی شاعری شاعری میں شجر"، مشمولہ مجید امجد - ایک مطالعہ، مرتب؛ حکمت ادیب، جھنگ: جھنگ ادبی اکیڈمی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱۳

(۲) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، چند اہم جدید شاعر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۰

(۳) ڈاکٹر سہیل احمد خان، "مجید امجد کی نظم نگاری کی محسوساتی اور فکری جہتیں"، مشمولہ، بیسویں صدی کا شعری ادب (مرتبہ بدر منیر الدین)۔ لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۴۳۲

(۴) ڈاکٹر سہیل احمد خان، "مجید امجد کی نظم نگاری کی محسوساتی اور فکری جہتیں"، مشمولہ، بیسویں صدی کا شعری ادب (مرتبہ بدر منیر الدین)۔ ص ۴۳۲

(۵) ایضاً ، ص ۴۳۳

(٦) ڈاکٹر ضیاء الحسن، "امروز"، مشمولہ مجید امجد کی نظمیں (ڈاکٹر آصف علی چٹھہ)، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۱۴ء، ص ۷۳

❁❁❁